صلاح وفساد

از جناب محمد زبیر صاحب راز ایم اے

مقامات :-

ا - عیش یا خوشی	Epicureanism
ب - افادیت	Utilitarianism
ج - جان اسٹوارٹ مل کا نظریۂ نوعیتِ عیش	Quality of pleasure
د - نیکی کا معروضی نظریہ یا خارجی تصور	Objectivity of Good
ہ - قرآن حکیم	

ا

تم بدی اور غم دونوں سے بھاگتے ہو۔ اس لیے یہ دونوں ہمارے موضوع سے خارج ہوئے۔ مگر خوشی اور بھلائی: تم ان دونوں کو اپنے دامن میں سمیٹ لینا چاہتے ہو۔ صبح و شام ان کے لیے بیقرار پھرتے ہو۔ پھر اسے کیا کہو گے جو نہیں اُن کے مساکن کو جانے والی سیدھی اور قریب کی راہ سے آشنا کر دے؟

جس منزل کی راہ پوچھتے ہو پہلے اسے متعین کر لو۔ اس لیے کہ یہ مسافر کا اپنا فرض ہے۔ میں کدھر جاؤں؛ یہ کسی سے نہیں پوچھا کرتے۔ جدھر جانا چاہتا ہوں اس کا راستہ کونسا ہے؛ یہ البتہ پوچھنے کے قابل بات ہے۔

۱۔ کیا خوشی نہیں دکھ اور نقصان پہنچاتی ہے؟ ——— ایسا ہوتا تو تم اُسے ڈھونڈتے کیوں؟

۲۔ نقصان نہیں تو کیا فائدہ اور بھلا ہوتا ہے؟ ——— تیسری تو کوئی صورت ہی نہیں

۲- خوشی پھر بھلائی ٹھیری۔ تمہارے لیے سُود مند اور بہتر ثابت ہوئی ———— یقیناً!
تمہاری منزل پھر صرف خوشی ہوئی۔ خوشی اور بھلائی، الفاظ دو تھے، مگر اصل مقصود صرف خوشی نکلی۔
حقیقتِ حال کا یہ فیصلہ پھر دُہرا لو: "خوشی میں نقصان ہوتا تو تم اُسے نہ ڈھونڈتے اور نہ قبول کرتے۔"
زندگی کے سارے ایام تمہارے سامنے کھلے ہیں۔ انہیں غور سے دیکھ جاؤ۔ کیا وہ تمہارے اس فیصلہ کی تصدیق کرتے ہیں؟

بچوں نے اُسے مٹی کے گھروندوں میں ڈھونڈا اور پایا۔ مگر جب ان کی خوشی کی جگہ بھوک، رات کی تاریکی اور تکان کی خلش نے لے لی تو وہ گھروں کو پلٹ آئے۔ اُسی خوشی کو پھر انہوں نے کھانے اور سونے میں تلاش کیا۔ کھانے میں کونین کی تلخی اور بستر پہ کانٹوں کی چبھن ہوتی تو وہ نہ کھاتے نہ لیٹتے۔

حیوانات کو اسی کی جستجو ہے۔ ہرن سبزہ زاروں میں چوکڑیاں بھرتا دُور نکل گیا ہے، مگر اُس کے دل سے پوچھو کہ شکاری کتّوں کا غم آفریں تصوّر بھی اُسے کس قدر بار ہو رہا ہے۔

نیک آدمی کو دیکھو، وہ اپنی نیک عملی کی زندگی میں لُطف اُٹھا رہا ہے اور خوش ہے۔

تو پھر یہ کیوں نہ کہا جائے کہ خوشی، مسرت، یا عیش، نیکی ہے؟

۳۵۵ ق م میں یونانی حکیم ایپکیورس (Epicurus) نے حصولِ مسرت کو ہی انسان کے ہر فعل کی غایت الغایات بتایا۔ مسرت کا حاصل کرنا، زندگی کو عیش و لذت میں کاٹ دینا، اُس کے پیروؤں اور اُس کے اپنے نزدیک سب سے بڑی بھلائی ہے۔ یہی ایک محور ہے جس کے گرد ہماری ساری زندگی گردش کرتی ہے۔ صرف انسان کی نہیں بلکہ حیوان اور دوسری مخلوقات کی بھی۔ ایک آرزو ہے جو اس کارخانۂ حیات کو آباد رکھے چلی آ رہی ہے، اور وُہ صرف لذت کے حصُول کی آرزو ہے۔ وہ دلیل لاتے ہیں کہ صرف لذت اور خوشی کے ایک عنصر کو حیاتِ ارضی سے نکال دو تو زمین پر بسنے والی مخلوقات کی ساری کارگاہیں سرد پڑ جائیں گی۔ پس انسان کا فرض صرف ایک ہے اور وہ خوشی کا حاصل کرنا ہے۔ خوشی نیکی ہے، بھلائی ہے، پس وہ جس قدر ہو "بے حد" ہو، اچھی ہے۔

اب زندگی کی طرف لوٹو اور دیکھو کہ شواہد و نظائر تمہارے اس فیصلہ کا کہاں تک ساتھ

دیتے ہیں۔

۱۔ تمہارے خزانے سونے اور چاندی سے پُر ہیں۔ تمہارے ہاں آخر عمر میں بچہ پیدا ہوا ہے۔ احباب کی دعوت پر روپیہ صرف کرتے ہو تو خوشی ہوتی ہے۔ اپنی نمود خود آپ دیکھتے ہو تو خوشی حاصل ہوتی ہے۔ تم نے خزانوں کے مُنہ چنانچہ کھول دیے اور جو تھا لٹا دیا۔ اب اُسی بستی میں کچکول لے کر گدائی کرتے ہو تو پھر کیا خوشی بھلائی ہے؟

۲۔ عیش پرستیاں تمہیں اتنی دُور لے گئی ہیں کہ تم جسمانی طور پر معذور ہو کر اپنی زندگی سے بیزار ہوگئے ہو، تو کیا پھر خوشی بھلائی ہے؟

۳۔ سارا گاؤں چوروں کی بستی ہے۔ انہیں چوری میں مسرت حاصل ہوتی ہے۔ باہم کسی کو نہیں چھوڑتے۔ کسی کے ہاتھ سے کسی کی عصمت محفوظ نہیں۔ تم بھی چور ہو۔ آج تمہارا سارا اندوختہ بھی لوٹ لیا گیا اور تمہاری حالت یہ ہے کہ اپاہج اور اندھے ہو چکے ہو۔ چور کو تمہارے گھر سے بہت بڑا خزانہ ہاتھ لگا ہے۔ مگر تم بتاؤ کہ یہ کارخانۂ حیات کیا مسرّت کے محور پر گھوم رہا ہے؟

تم کہو گے، نہیں۔ اس لیے زندگی کے مذہبِ عمل کی تلاش کسی اور گوشہ میں کرنی چاہیے۔

تمہارا یہ فیصلہ تمہارے جسم و جان کے ایک ایک ریشے کی صدائے حال ہے۔ اور یہ صرف تمہارا اور تمہارے عہد کا فیصلہ ہی نہیں ہے بلکہ آغازِ آفرینش سے اب تک افراد اور قومیں اسی ایک نتیجے پر پہنچتی چلی آئی ہیں۔ اگر تم دُور پیچھے ماضی کے تاریک پردوں میں جھانک سکتے ہو تو اقوامِ عالم کی سرگزشتوں کے سُراغ کو نکلو۔ تم اسی ایک نتیجے پر پہنچو گے جو تمہارے سامنے مرتب ہو رہا ہے۔ تم ہر عہد میں کتنی ہی ایسی بستیاں پاؤ گے، کتنے ایسے افراد اور کتنی ہی ایسی قومیں دیکھو گے جو عیش و عشرت میں غرق ہیں، جن کی زندگیاں صرف عیش پرستیوں کے لیے ہو کر رہ گئی ہیں۔ پھر جب عشرت کی سرمستیاں اُن کے لیے دردناک انجام لے کر آئیں تو شدتِ دہشت و حیرت سے اُن کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں اور پھر اُن کے لب و دہن سے جو پکار بلند ہوئی وہ اس کے سوائے کچھ نہ تھی: افسوس ہم پر، ہم انجام کی اس ہولناک گھڑی سے غفلت میں رہے، بلکہ ہم خود اپنی جانوں پر ظلم و شرارت کرتے رہے، آخر

وہ اپنی بستیاں چھوڑ کر بھاگ گئے۔

فَلَمَّآ اَحَسُّوْا بَاْسَنَآ اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَرْكُضُوْنَ ۝ لَا تَرْكُضُوْا وَارْجِعُوْٓا اِلٰى مَآ اُتْرِفْتُمْ فِيْهِ وَمَسٰكِنِكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْـَٔلُوْنَ ۝ قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ۝

(الانبیاء - ۱۱-۱۲-۱۳)

جب ہمارا عذاب انہوں نے محسوس کیا تو دیکھو یکایک وہ بستیوں سے بھاگے جا رہے ہیں۔ اب بھاگتے کہاں ہو؟ اپنے اسی عیش و عشرت کی طرف لوٹو جس نے تمہیں اس قدر سرشار کر رکھا تھا)۔ انہی مکانوں میں واپس جاؤ (جن کی مضبوطی کا تمہیں غرہ تھا)، شاید وہاں تدبیر و مشورہ میں تمہاری ضرورت ہو اور (تم سے کچھ دریافت کیا جائے۔ انہوں نے کہا ہم پر افسوس ہم ظالم تھے۔

اپیکیورس کے پیروؤں نے بھی اسے محسوس کیا۔ چنانچہ وہ ایک قدم اٹھا کر آگے بڑھے اور کہا کہ زندگی کی تگ و دو کا مرکز ہے تو خوشی ہی مگر اس کی دو صورتوں میں انسان کے لیے امتیاز کرنا لازم ہے۔ پہلی صورت اُن مسرتوں کی ہے جو عارضی ہوتی ہیں، ابھی تھیں اب مٹ گئیں۔ دوسری قسم کی وہ مسرتیں ہیں جو دیرپا ہیں۔ وہ خوشی جو شدید جذبات اور جوش مثلاً عشق اور غصہ کی بندگی سے حاصل ہوتی ہے پہلی قسم کی عارضی خوشی ہے۔ اس سے روح کو نسبتاً دکھ زیادہ پہنچ جاتا ہے۔

آرام، سکون، امن، احساسات سے کنارہ گیری، یہ دوسری نوع کی مسرتیں ہیں اور دیرپا ہیں اس لیے بہتر ہیں۔ ایسی حالت کی چنانچہ تلاش کرنی چاہیے جہاں کوئی چیز کسی حال اور کسی وقت انسان کو رنجیدہ نہ کر سکے۔

اب آؤ اسے ایک نقاد کی نظر سے دیکھیں۔ کیا یہ ایک بن باسی جوگی کی زندگی نہیں ہے جو جہدِ حیات سے کنارہ کش ہو کر بستی سے دُور نکل جاتے؟ وہاں بھی اُسے اگر صبح و شام کے کھانے کی فکر رنجیدہ کرتی ہو، وہاں بھی اگر درندوں سے اُس کا دل دہلتا ہو، تو وہ اس کے سوا اور کیا چارۂ کار پائے گا کہ زمین و آسمان کے درمیان کوئی مسکن تلاش کرے یا خودکشی کر لے۔ کیونکہ بن باسی کی زندگی بھی اس کے موافق نہیں بیٹھتی۔ چنانچہ اپیکیورس کے پیروؤں کا ایک فرقہ اس طرف گیا ہے کہ

خودکشی بہترین بھلائی ہے اور جو انتہائی مسرت چاہے وہ اپنے حلقوم پر چھری رکھے اور خودکشی کرے تاریخ نے اس گروہ کے خودکشی کرنے والوں کے نام محفوظ رکھے ہیں۔ تو پھر کیا خوشی کے حصول کے گرد انسان کی زندگی اور زندگی کے جملہ مطالبات اور فرائض کو مرتب کیا جا سکتا ہے؟ ———— ظاہر ہے کہ نہیں!

ب

افلاطون نے تھیئٹیس (Theaetus) میں ثابت کیا ہے کہ اگر عقل سے الگ ہو کر کوئی مسرت کا تعاقب کرنا چاہے گا تو ٹوٹے میں رہے گا اور اُسے نہیں پائے گا۔ عقل اور فہم سے الگ ہو جانا اس کے نزدیک ایک ہی وقت میں اپنے حافظے سے الگ ہو جانا ہے، مستقبل اور ماضی سے کٹ جانا ہے۔ نہ مستقبل کی خوشیوں کا انتظار اور تیاری، نہ ماضی کی خوشیوں کی یاد اور لذت بھلا جو عقل کو تیاگ کر خوش رہنا چاہے وہ سوچے گا کیوں؟ کل وہ اسی ماں کا بیٹا تھا۔ وہ اسے یاد رکھے تو کیوں؟ اس کے فرائض کو ادا کرے تو کیوں؟

افلاطون کا مقام اسی حکیم کے قریب نظر آتا ہے، اس نے کہا :۔

سچی اور جھوٹی خوشی میں امتیاز کرو۔

آسودہ اور پاک خوشی میں فرق کرو۔

شریف اور وضیع میں فرق جانو۔

افلاطون کے نتائج فکر سے آگے بنتھم (Jeremy Benthan 1748-1832) کی کرید شروع ہوتی ہے۔ اُس نے ریاضی کے ٹھوس اور محسوس اصول پر مسرت کے اس فلسفے کو تحلیل کیا اور یوں اس کی ایک عملی صورت نکالی۔ اس کی تفصیل کو سمجھ لو۔

ہمارے سامنے مسرت انگیز مشاغل کی ایک فہرست آگئی ہے۔ جوانی کی اٹھان اور جذبات کے طوفان کا مطالبہ یہ ہے کہ ساری عشرتیں اپنے دامن میں لپیٹ لی جائیں۔ اور دل نے یہ کہہ دیا ہے

کہ لطف اندوزی ہی جب مدعائے حیات ہے تو یکبارگی ایک ہی فرصت میں سب کو دیوانہ وار شروع کر دیا جائے۔ مگر افلاطون نے متنبہ کر دیا ہے کہ یوں عقل و فہم سے جدا ہو کر خوشی کے تعاقب میں نکلو گے تو گھاٹے میں رہو گے۔ اس لیے تمہارا طریقِ کار یہ ہونا چاہیے کہ ساری فہرست میں سے پسندیدہ خوشی کا انتخاب کر لو۔ اب سوال یہ ہوا کہ یہ کیسے کریں؟

بنتھم کہتا ہے کہ جس طرح تم ریاضی کے اعداد کو جمع کر لیتے ہو اور پھر ایک صحیح نتیجہ اخذ کر کے مطمئن ہو جاتے ہو، ٹھیک اسی طریق پر جتنی مسرتیں تمہیں اپنی طرف بلا رہی ہیں اُن پر ذیل کے چار گوشوں سے نگاہ ڈالو اور نتائج کو ایک جگہ جمع کر لو۔ ایسا نہ ہو کہ انہوں نے تمہیں بلایا اور تم دیوانے ہو کر دوڑ گئے۔

چار گوشے :۔

۱۔ کیا اس کام سے یقینی طور پر خوشی حاصل ہو گی یا یہ غیر یقینی آرزو ہے؟

۲۔ کیا یہ خوشی حاصل ہونے والی ہے، غم کی ہر ممکن آلودگی سے پاک اور صاف ہے؟ یعنی اس میں کوئی ایسا پہلو تو نہیں جو سامنے آ کر ہماری عشرت کو مکدر کر دے؟

۳۔ کیا یہ دیرپا ہو گی یا جلدی مٹ جانے والی ہے؟

۴۔ حاصل ہونے والی خوشی کی مقدار کس قدر ہے، بے کراں ہے یا تھوڑی سی؟

اب اگر اس تحقیق کے نتائج کا مطالبہ تمہارے حق میں ہے تو بس جو بھی عشرت تمہارے سامنے آ گئی ہے کر گزرو، وہ تمہارے لیے بھلائی ہے۔ اپنی اس شکل میں زندگی کا یہ افادی نظریہ (Philosophy of Utility) ہے کہ کام صرف وہ کرو جس میں سب سے کم زحمت اُٹھانی پڑے اور سب سے زیادہ عیش کی مقدار ملے۔ یہی نیکی ہے۔ یعنی نیکی تمہارا ایک ذاتی اور انفرادی انتخاب ہے۔ تمہارا ذاتی رجحان ہے۔ اصطلاحی زبان میں نیکی کی حیثیت موضوعی یا داخلی (Subjective position) ہے۔ تمہارے اپنے اندر کی آواز اور ذاتی میلان کے ماتحت اس کی شکل بدلتی رہتی ہے۔

ابھی یہ مقام اپنی پوری کیفیت اور مطالبات کی رو سے شاید واضح نہ ہوا ہو اس لیے رک جاؤ تاکہ اسے کھول کر تمہارے سامنے رکھ دیا جائے۔ چند سطور پیچھے لوٹ کر پھر بنتھم کے ان چار معیاری

اصولوں پر پہنچ جاؤ۔ وہ یہ ہیں :-

۱- خوشی یقینی ہے یا غیر یقینی ؟

۲- اس میں غم کی کوئی آلودگی تو نہیں ؟

۳- وہ دیرپا ہے یا عارضی ؟

۴- زیادہ ہے یا تھوڑی ؟

اب انہی معیاروں کو سامنے رکھ کر دیکھو۔ ایک عورت بادشاہِ وقت کی بیوی ہے۔ جوان ہے۔ نہایت خوبصورت ہے۔ دولت کی اس کے پاس کمی نہیں۔ وہ اپنے غلام پر عاشق ہو جاتی ہے۔ اپنے عظیم الشان محل کے ایک ایسے اندرونی حصے میں جہاں کسی راز کے کھلنے کا اندیشہ نہیں اس غلام کو طلب کرتی ہے اور اپنے مطالباتِ جنسی اس کے سامنے پیش کر دیتی ہے۔ دولت، حُسن، جوانی اور عیشِ جاودانی سب اس غلام کے قدموں میں ہیں اور ملکہ کی شیفتگی، اس کی دانشمندی اور اس کا اپنا مفاد ہر چیز اس امر کی ضمانت دے رہی ہے کہ اس کا مطالبہ قبول کر لینے میں غلام کے لیے مزے ہی مزے ہیں۔

اب غور کرو: (۱) غلام کے لیے خوشی یقینی ہے، کسی شک کی اس میں گنجائش ہی نہیں۔ (۲) اس عیش میں غم کی کوئی آلودگی نہیں، وہ ملکہ کی حفاظت میں ہے اور ملکہ کا اپنا مفاد یہ چاہتا ہے کہ راز کھلنے نہ پائے۔ البتہ اس کی خواہش رد کر دینے میں جان تک کا خطرہ ہے۔ (۳) ملکہ اس پر ہزار جان سے فدا ہے، اس لیے یقینی ہے کہ جیتے جی غلام کے پاؤں دھو دھو کر پیتی رہے گی۔ (۴) خوشی کی مقدار بے حد و حساب ہے۔ ایک غلام اور ملکۂ وقت اس کے قابو میں ہو۔ مال بھی، جمال بھی، عیش و محبت بھی، اور حکومت و اقتدار بھی۔ اس خوشی میں آخر کس چیز کی کمی ہے ؟

دیکھو، چاروں معیار پورے ہو رہے ہیں۔ بینتھم کی افادیت کا صاف صاف مشورہ یہ ہے کہ غلام کو اپنے جسم و جان کی پوری قوت کے ساتھ، اپنے دامنِ مطلب کو پورا پھیلا کر اس خوشی کو سمیٹ لینا چاہیے۔ نادان ہوگا اگر اس موقعہ کو ہاتھ سے دے گا۔

بینتھم کے نزدیک ایسی خوشیاں نیکیاں ہیں اور ابنِ آدم پر ان کی تلاش فرض ہو چکی ہے۔ جو مثال

ہم نے دی ہے اس نوعیت کی مثالیں عام نہیں تو نہ ہوں، نایاب نہیں ہیں۔ کیا ایک چور کو ایسے مواقع بہم نہیں پہنچ سکتے جن میں بنتھم کے چاروں معیار پورے ہوتے ہوں؟ کیا بہت سے رشوت خوار حاکم ہماری آنکھوں کے سامنے یقینی، بے غم، دیرپا اور بے حساب خوشی جمع نہیں کر رہے ہیں؟

یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اپیکیورس کے اندھے عیش پرست سے افلاطون اور بنتھم کا دانا عیش پرست بہتر ہے جو چوری، زنا اور جھوٹ کا مرتکب ہونے سے پہلے موقع دیکھ لیتا ہے۔ مگر جس بات پر دونوں متفق ہیں وہ یہ ہے کہ انسان کے لیے اس کی اپنی انفرادی صواب دید سے الگ نیکی کا کوئی دستور نہیں۔ جسے تم اچھائی سمجھتے ہو لازم نہیں کہ تمہارے دوست بھی سمجھیں، لازم نہیں کہ تمہاری نیکی سماج کے لیے بھی نیکی ہو۔

بنتھم کا پیرو رحم دل ہو سکتا ہے، کیونکہ وہ دانا ہے اور افادیت کا مطالبہ یہ ہے کہ جب کل اس پر مصائب کا پہاڑ ٹوٹے گا تو کوئی اس پر رحم کرے گا۔ وہ تمہارا دوست ہو سکتا ہے، مگر اس امید پر کہ جب وہ آلام میں گھر جائے گا تو تم دوستی کرو گے۔ وہ اپنا عہد اس لیے استوار رکھتا ہے کہ دوسرے اس سے بد عہدی نہ کریں۔

اس قسم کی سیرت کیا انسان کے لیے موزوں ہے؟ تم پکار اٹھو گے کہ نہیں۔ اخلاقیات کے مفکرین بھی تمہارے ساتھ ہم زبان ہیں، مگر وہ دو گروہوں میں بٹ جاتے ہیں۔

پہلا گروہ جان اسٹوارٹ مل (John Stuart Mill) کا پیرو ہے جس نے خوشی کی نوعیت کو انتخاب و عمل کا معیار قرار دیا۔

دوسرا گروہ کانٹ (Kant) کی سرکردگی میں نکلتا ہے اور نیکی کا ایک خارجی یا معروضی وجود (Objective entity of Good) تسلیم کرتا ہے۔ کلیسائی مفکرین کی حمایت اس کے ساتھ ہے۔

ج

جان سٹوارٹ مل کہتا ہے کہ تم اپنی تاجرانہ زندگی کے پورے پھیلاؤ کو اگر غور سے دیکھ سکو تو تمہیں نظر آئیگا کہ ابھی تم بنتھم کی طرح صرف یہ نہیں دیکھتے کہ تم اپنے داموں سے زیادہ سے زیادہ کون سا سامان خرید

سکتے ہو۔ بلکہ تم یہ بھی سوچتے ہو کہ سامان تھوڑا ہو تو ہو مگر بذاتِ خود اچھا ہو۔ تم صرف (Quantity) کمیت ہی نہیں بلکہ کیفیت (Quality) دیکھتے ہو۔ لہٰذا بنتھم نے ہمیں جو یہ بتایا تھا کہ نتائج کو جمع کر لو اور پھر تعداد دیکھ لو کہ وہ کم تو نہیں، مسرت کے انتخاب کا یہ طریقہ صحیح نہ ہُوا۔ بلکہ صحیح یہ ہُوا کہ مسرت کی مقدار کم ہو تو ہو مگر اس کی نوعیت و کیفیت اچھی ہو۔ نہایت ہی اچھی نوعیت کی خوشی ایک لمحہ کے لیے ملتی ہے تو لے لو۔ بُری قسم کی خوشی ایک سال کے لیے میسّر آتی ہے تو چھوڑ دو۔

خوشی کی نوعیت کا اب کیسے پتہ چلے؟ کیسے یقین آئے کہ فلاں عیش گو مقدار میں تھوڑا ہے مگر مقابلۃً اعلیٰ قسم کا ہے؟ خود سٹوارٹ مل سے یہ سوال کیا گیا۔ اُس نے کہا میرے نزدیک اس کا جواب صرف ایک ہے۔ خوشی کے کوئی سے دو کاموں میں سے نوعیت میں اچھا وہ ہو گا جسے سب یا قریبًا سب اچھا سمجھیں۔ بشرطیکہ وہ ان دونوں کو تجربۃً دیکھ چکے ہوں، اور ہر مجلسی دباؤ سے بے نیاز ہو کر اس کے بارے میں رائے دے رہے ہوں۔ اب اگر اس کی راہ کٹھن بھی ہو گی تو میں اُسے اختیار کر لوں گا مثلاً:

ایک بنیا کہتا ہے کہ افسانہ نگاری میں کیا دھرا ہے۔

ایک پہلوان کا خیال ہے کہ شاعری کے مقابلہ میں کشتی لڑنے میں زیادہ مسرت اور زیادہ عیش ہے۔

مل کہتا ہے میں ان دونوں کی شہادت کو معتبر نہیں سمجھوں گا کیونکہ شاعری اور افسانہ نگاری کے عیش پر تبصرہ کرنے کے لیے بنیا اور پہلوان کسی طرح بھی موزوں اشخاص نہیں ہو سکتے۔

اب آگے بڑھے تو ایک زاہد مل سے کہہ رہا تھا کہ "شراب بُری چیز ہے"، پاس سے ایک رندِ خرابانی پکار اُٹھا "ہائے کمبخت تو نے پی ہی نہیں"۔ اب مل کیسے تسلیم کرے گا؟ بات ضغطے میں پڑ گئی۔ جہاں تک شراب کی قصیدہ گوئی کا تعلق ہے کون ہے جو اُردو اور فارسی شاعری کی شہادتیں صفحۂ ہستی سے مٹا سکے۔

در عہدِ تنگ دستی در بادہ کوش و مستی ۔۔۔ کیں کیمیائے ہستی قاروں کند گدا را ۔۔۔ حافظ

اور اُردو نے تو مُہر لگا دی کہ خواہ تصوّف کے مسائل ہی بیان کیوں نہ کرنے ہوں، ساغر و مینا کہے

بغیر بات نہیں بنتی ؎

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو بنتی نہیں ہے ساغر و مینا کہے بغیر غالب

سبحان اللہ! بادہ و ساغر کے الفاظ میں کس قدر شیرینی ہے کہ "غالب کے ہمعصر" یا "ہندوستان کے رہنے والے" کسی اور چیز کا نام تک سننا گوارا نہیں کرتے۔ مگر ذرا آگے چل کر دیکھو۔ وہی انسان جس کا فتویٰ یہ تھا کہ شراب "قاروں کند گدارا" وہ بوڑھا ہو کر ایک دوسرا ہی مشورہ دے رہا ہے:۔

چوں پیر شدی حافظ از میکدہ بیروں شو رندی و خراباتی در عہدِ شباب اولیٰ

اب تم اُس کا کونسا مشورہ قبول کرو گے؟ پہلا یا دوسرا؟ کیا دوسرا؟ کیوں؟ تم کہو گے "اس نے یہ طویل تجربہ کے بعد کہا" مگر شراب پر رائے رکھنے کے لیے "پیری" ہی کیوں مناسب سمجھی جائے؟ یہ عہد تو وہ ہے جب عہدِ شباب اور یوں کہو کہ زندگی کی ساری صلاحیتیں چھوڑ کر رخصت ہوتی ہیں اور تم جوان ہو۔ پھر بڑھاپے کی رائے کیوں قبول کرنے لگے؟

کیا مل نے نوعیتِ عیش کی تلاش کا یہ طریق مقرر کر کے ٹھوکر نہیں کھائی؟ "عیش کی نوعیت" کا نکتہ تو خوب تھا مگر وہ خود اس کی بلندیوں کا ساتھ نہ دے سکا۔

۷

فلاسفہ کا ایک دوسرا گروہ اب کانٹ کی سرکردگی میں آگے بڑھتا ہے۔ کلیسائی مفکرین اس کے جلو میں ہیں۔ نتائج کے الجھاؤ کا کھوج لگاتے ہوتے وہ اُس چشمۂ فکر تک پہنچے جہاں سے اس پہلے گروہ کے جملہ افکار سیرابی حاصل کرتے تھے۔ انہوں نے کہا غلطی فروع میں نہیں اصل میں ہے۔ دلائل کے درخت کی ٹہنیوں اور پتوں میں نہیں بلکہ جڑ میں ہے۔ یہ کہنا کہ خوشی نیکی یا بھلائی ہے، یہی بنیادی لغزش ہے۔ نیک عملی کی زندگی میں اکثر و بیشتر ایسے مواقع آجاتے ہیں جن کی راہ ماتم، دکھ اور مصائب کے کانٹوں سے پُر ہوتی ہے۔ مثلاً حفظِ وطن کے لیے غازی اژدرِ دم توپوں کے سامنے جا رہا ہے۔ وقت کے جابر ہاتھ سچ کہنے والی زبان کو گدی سے کھینچوا رہے ہیں۔ گو نیکی کی راہ چلنے والوں کو بعض اوقات خوشی نصیب ہو جاتی ہے مگر نیکی اور خوشی لازم ملزوم نہیں۔ اس لیے خوشی کو بھلائی قرار دینا

فیصلے کی غلطی ہے۔

اچھا، مان لیا کہ خوشی نیکی نہیں ہے۔ پھر نیکی آخر ہے کیا چیز؟ یہ محصلین: کانٹ اور اس کے پیرو، جواب دیتے ہیں "وہ ایک فعل ہے جس میں خود اپنا حُسن ہوتا ہے"۔ "ہمیں اسے کیوں اختیار کرنا چاہیے؟" وہ کہتے ہیں "نیکی کو ہمیں اُس کے اپنے حُسن کے لیے اختیار کرنا چاہیے"۔ صداقت اور حُسن بذاتِ خود بھلے ہیں۔ زنا بذاتہٖ برائی ہے۔ یعنی نیکی اپنے الگ وجود کے ساتھ قائم ہے (Objective existence of Good) وہ محاسن کی ایک فہرست ہے، اخلاق کا ایک ضابطہ ہے جس پر ہمیں چلنا ہے۔ عیش نہیں بلکہ یہ ضابطۂ حیات زندگی کا محور ہے۔ اس ضابطہ کی زندگی کو کانٹ Formalism کہتا ہے۔

کانٹ نے نیکی کا جو تصور ہمارے سامنے رکھا ہے۔ وہ اپنے اجمال میں یہ ہوا:-

(ا) نیکی کا ایک خارجی وجود ہے۔

(ب) خوشی اور نیکی لازم ملزوم نہیں۔ نیکی کو ہم اُس کے نیک وجود کے لیے پسند کرتے ہیں، خوشی کی غرض سے نہیں کرتے۔

نیکی کا اگر کوئی ایسا خارجی و معروضی ضابطہ ہے جسے انسانی فطرت تعمیر نہیں کرتی اور جس کی پیروی میں یہ بھی لازم نہیں کہ انسان کو خوشی نصیب ہو، تو پھر اُس کا مُصنّف کون ہے؟ ماضی یا حال کے انسانی تجربات کو اگر اس کا مُصنّف کہا گیا تو یہ انسان کا ایک ذاتی و داخلی فعل ہو جائے گا، خارجی و معروضی نہ رہے گا۔ مفکرین کی پہلی جماعت نے بھی تو یہی کہا تھا۔ انہوں نے بھی تو خود انسان کے اندر پیدا ہونے والے ایک جذبے یا روشنی کو اس کے لیے کافی سمجھا تھا۔ اب دونوں میں اختلاف کونسا رہ گیا؟ کیا صرف یہی کہ محصلین کے پہلے گروہ نے انسان کے دو اصولی جذبات غم اور خوشی میں سے خوشی کو اپنی جانوں کے لیے بہتر سمجھا؟ کیا وہ غم اور دُکھ کو انتخاب کرتے؟ وہ ایسا کیوں کرتے؟ انسان نے اپنی نسلی سرگزشت میں کہیں بھی اور کبھی بھی تو ایسا نہیں کیا۔

یہ استدلال ایک دوسرے گوشے کو بھی بے نقاب کر رہا ہے۔ وہ یہ کہ غم کو انسان طبعًا پسند

نہیں کرتا؛ رہ گئی خوشی تو خوشی کا انتخاب کانٹ کی نگاہ میں برائی ہے یعنی انسان کو اس کی جبلت پر نہیں چھوڑا جاسکتا، اس کی فطری روشنی پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔

کلیسائی مفکرین بھی اس کے ساتھ آواز ملاتے ہیں کہ ہاں نہیں کیا جاسکتا۔ یہ اس لیے کہ وہ انسانی فطرت کو اعتماد کی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ اُن کا خیال ہے کہ انسان کی سرشت میں گناہ ہے۔ سولھویں صدی مسیحی تک ان کی تبلیغی سرگرمیوں کا صرف یہی ایک تعلیم مرکز بنی رہی۔ سینٹ پال کی طرف جو ابنیتِ مسیح کی تعلیم منسوب کی جاتی ہے اس کی تمام تر بنیاد صرف اسی ایک خیال پر رکھی گئی تھی۔ اس کلیسائی تعلیم کے نفوذ کا یہ عالم ہے کہ مل در فلسفۂ لذت کا داعی جب خوشی میں "نوعیت" کا عنصر پیدا کرنا چاہتا ہے تو اُسے انسانی فطرت میں کوئی صلاحیت نظر نہیں آتی۔ وہ بھی انسانی سرشت کے گناہ سے اس درجہ خائف ہے کہ وہ یہ نہ کہہ سکا کہ انسان خود اپنی فطرت کی پیروی کرتے ہوئے بھی بھلائی کو پہنچ سکتا ہے۔ چنانچہ وہ دلائل کے مواخذہ سے دامن بچا کر گزرنا چاہتا ہے۔ اور صرف یہ کہہ کر خاموش ہو جاتا ہے۔ کہ

Many Stoic as well as Chistian elements

should be introduced in Morality

"ہمیں اخلاقیات میں رواقی اور عیسائی عناصر کو شامل کر لینا چاہیے"

ظاہر ہے کہ یہ الفاظ اس کی معذوری کے آئینہ دار ہیں۔ یہاں دلیل اس کی معاونت نہیں کر رہی ہے۔

کلیسا نے الہام کو نیکی کا خارجی مصنف کہا (اسلام میں الہام کا تصور بالکل جداگانہ ہے اور وہ اپنے مقام پر بسط سے آئے گا) اور اس سے نیکی کا یہ معروضی تصور قائم ہوا۔ مگر اس تصور کو سترھویں صدی مسیحی میں ایک آخری مہلک ضرب پہنچی۔ عیسائی مبشرین نے دور دست جزائر میں سفر کیے۔ زمین کے ایسے کونوں تک پہنچے جہاں ابنیتِ مسیح اور کفارہ کی کوئی آواز نہ پہنچی تھی۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہاں کے بسنے والے اخلاق کے نہایت بلند اصول پر کاربند تھے۔

آخر کار ان ہی سیاحوں کی بدولت "نیک سیرت وحشی" (Virtuous savage) کی نوع کی اصطلاحات وضع ہوئیں۔

فیصلہ طلب امر اب صرف یہ رہ گیا کہ فطرتِ انسانیہ کا مطالعہ کرتے ہوئے خوشی کے مصنفین نے ٹھوکر کہاں کھائی اور حقیقت کہاں چھپی ہے؟

ب

جب نباتات اور حیوانات اپنی فطری استعداد کی حدود میں نہایت صلاحیت کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں اور انہیں کسی بیرونی یا انسانی ضابطۂ اخلاق کی ضرورت پیش نہیں آتی تو پھر کیا یہ صرف انسان ہی ہے جس کے لیے اس کی اپنی فطرت میں کوئی راہنمائی موجود نہیں؟ یقیناً یہ انسان نہیں بلکہ جمادات کی کوئی لایعنی شکل ہوگی جس کی زندگی کی عنان تم اس کی اپنی فطرت کے ہاتھوں میں دیتے ہوئے گھبراتے ہو۔ انسانی اخلاق کا اصل کار یا مذہب عمل دوسری جملہ مخلوقات کی طرح اس کی اپنی سرشت ہی میں تلاش کرنا چاہیے۔ اپیکیورس کے نظریہ یعنی نیکی کے موضوعی تخیل میں صحیح صرف اس قدر ہے کہ تلاش صحیح گوشہ میں کی گئی۔ مگر خامی یہ رہی کہ تلاش کے صرف چند قدم اٹھا کر ڈھونڈنے والوں نے دم ہار دیا، جو نشانِ منزل تھا اسے وہ منزل سمجھے اور پھر وہیں بیٹھ گئے۔ وہ معلوم نہ کر سکے کہ اس کی تنقیص سے روشنی آگے بڑھتی ہے۔ چنانچہ ضابطہ کے مفکرین (Formalists) نے زندگی کے شواہد سے یہ ثابت کر دیا کہ کوئی ایک شخص ہو یا ایک پوری جماعت عیش طلبی کے جذبات میں گم ہو کر نپ نہیں سکتی۔ اس کی زندگی میں بناؤ کی جگہ بگاڑ کے آثار ابھر کر سامنے آجائیں گے۔ تعمیر، قیام اور صلاح کی لطف اندوزیوں کی بجائے زوال، فساد اور فنا سے دوچار ہونا پڑے گا۔

مدنیت کی پہلی اینٹ ماں ہے۔ انسانی تہذیب کی اس سے زیادہ ابتدائی کوئی صورت ذہن میں نہیں آسکے گی کہ کسی جنگل کے ایک گوشے میں ایک ماں ہو اور اس کی گود میں ایک بچہ ہو جسے وہ جنگل کے وحشی درندوں سے چھپائے پھرتی ہو۔ حفظِ نسل کا یہ پہلا درس ہے جو بچے نے ماں کی گود سے سیکھا۔

عقاب کو بچوں پر لپکتے دیکھ کر ماں نے انہیں سینے سے چمٹا لیا۔ اور پھر ظلم کی جابر طاقتوں کو روکنے کے لیے اس نے اپنے کمزور اور ناتواں بازوؤں کو پھیلا دیا۔ یہ تو اکثر ہوتا رہا کہ حملہ آور نے اُسے مہلک زخم پہنچائے، مگر یہ کبھی نہ ہوا کہ ماں نے بچوں کو بچانے کے لیے خود موت کے منہ میں جانا قبول نہ کر لیا ہو۔ نسل کو بچانے کے لیے خود اپنی جان پر کھیل جانے کا یہ دوسرا سبق بھی انسان کو ماں کی گود نے دیا۔

چنانچہ جوان ہوا تو اس نے اسی آئین پر اپنی ماں اور بہن بھائیوں کی نگہداشت کی۔

(۱) انسان جب اپنے اعمال کو دیکھتا ہے کہ وہ اس کے قیام و بقاء کا باعث ہو رہے ہیں تو اس کے دل و دماغ جس جذبے سے اپنی پسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں وہ خوشی ہے۔ خوشی پھر فعل نہیں فعل کا نتیجہ ہوئی۔

(۲) اور جب اُسے یہ نظر آتا ہے کہ اس کے اعمال اس کے بہن بھائیوں اور دوسرے اقارب کے لیے باعثِ صلاح اور باعثِ قیام ثابت ہو رہے ہیں تو وہ انہیں اور بھی زیادہ پسندیدگی سے دیکھتا ہے۔ مدنیت کا یہ دوسرا بلند تر درجہ ہے۔

اور اس دوسرے مقام پر کنارِ مادر نے اُسے یہ درس دیا ہے کہ جو ملے لٹا دے اور پھر خوش ہو۔ صبح و شام کی محنتِ شاقہ اور میدانِ جنگ میں خون کے چھینٹے ان سب میں خوشی کے چشمے اُبل رہے ہیں۔ مسٹر چرچل برطانیہ کے وزیرِ اعظم نے ابھی کل ہی کہا کہ ہم اپنے بچوں کے لیے لڑ رہے ہیں۔ حفظِ نفس کی اسی خواہش بلکہ ضرورت نے اعمال کی لمبی تاریخ مرتب کر دی۔ اور وہ قبیلہ، ملک اور قوم کے مدارج تک آ پہنچی۔ قرآن نے اسے ملک اور قوم کی حدود سے اچھالا اور وہ انسانیت کی بیکرانیوں سے ہمکنار ہو گئی۔[1]

[1] فاضل مقالہ نگار کے بیان سے ایسا مترشح ہوتا ہے کہ حفظِ نفس اور حفظِ نوع کا جذبہ جو حیوان اور انسان کی جبلت میں ودیعت کیا گیا ہے وہی قانونِ صلاح و فساد کا مبدأ ہے اور قرآن نے اسی پر اپنے اخلاقیات کی بنیاد رکھی ہے۔ اگر ان کا خیال یہی ہے تو یہ کسی طرح صحیح نہیں۔ یہ دراصل مغربی اہلِ فکر کی بنیادی غلطیوں میں سے ایک ہے کہ وہ انسان کو حیوان سے

(باقی صفحہ ۳۲ پر)

ہر فعل جس کا رخ انسانی صلاح وفلاح کی طرف ہو وہ اچھا ہے، خیر اور نیکی ہے، اور وہی حقیقی خوشی

(حاشیہ ص۸۱) زائد کچھ نہیں سمجھتے اور اسی لیے انسان کے مذہبِ عمل کے مبادی حیوانی زندگی کے قوانین میں تلاش کرتے ہیں۔ حالانکہ انسان من حیث الانسان ہرگز حیوان نہیں ہے۔ اس کو آلہ اور سواری کے طور پر حیوانی جسم ضرور دیا گیا ہے لیکن وہ بجائے خود حیوان نہیں۔ اگر وہ حیوان ہوتا تو سرے سے اخلاق کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ اخلاق کا سوال صرف اختیار (Freewill) کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ حیوان، جماد، نبات وغیرہ ذی اختیار مخلوق نہیں ہیں بلکہ قوانینِ طبیعی سے کلیتہً مقہور ہیں اور ان کا بناؤ اور بگاڑ ایسی قوتوں کے عمل سے ہو رہا ہے جن میں وہ اپنا آزادانہ انتخاب کہیں استعمال نہیں کر سکتے، اس لیے وہ اخلاقی وجود نہیں ہیں۔ برعکس اس کے انسان کو ایک خاص حد کے اندر اختیار دیا گیا ہے اور اس کے صلاح وفساد کا سررشتہ تمام تر طبیعت کی جابر قوتوں ہی کے ہاتھ میں نہیں ہے بلکہ بڑی حد تک اس کے اپنے آزادانہ انتخاب پر منحصر ہے، اس لیے وہ ایک اخلاقی وجود ہے اور اس بنا پر اس کی حیثیت تمام مخلوقات سے بالکل مختلف ہو جاتی ہے۔ قرآن سب سے پہلے انسان کی اسی امتیازی حیثیت کو نمایاں کرتا ہے پھر وہ انسان کو بتاتا ہے کہ تیری فلاح اور تیرا خسران، تیرا بننا اور بگڑنا منحصر ہے اس پر کہ تو اپنے اس اختیار کو کس طرح استعمال کرتا ہے۔ اس کے بعد وہ انسانی سعی کے دو راستوں کو واضح اور روشن فرق کے ساتھ پیش کرتا ہے ایک یہ کہ آدمی اپنی مختاری سے دھوکا کھا کر اپنے آپ کو خود مختار وغیر ذمہ دار سمجھ لے اور اپنی حیوانی جبلت کو اپنا پیشوا اور رہنما بنا کر اس کے پیچھے چلنے لگے۔ اور محض قوانینِ طبیعی (Physical laws) سے اپنی زندگی کا ضابطہ اخذ کر کے صرف اس دنیا کی کامیابیوں کے لیے اپنی مساعی وقف کر دے۔ یہ روش چونکہ فطرتِ کائنات اور فطرتِ انسانی دونوں کے خلاف ہے، نہ اس کائنات کا انتظام اس طور پر بنا ہے کہ یہاں کسی کو خود مختاری کا حق ہو اور نہ انسان کی فطرت اس طور پر بنی ہے کہ وہ نرا حیوان بن کر محض قوانینِ طبیعی پر چلے، اس لیے اس کا آخری نتیجہ فساد ہے، بگڑنا اور ٹوٹ جانا ہے، تباہی وخسران ہے۔ دوسرا راستہ یہ ہے کہ انسان اس کائنات کے حکمران اور خود اپنے صانع کو اپنا حکمران سمجھے، اور اس کے دیئے ہوئے اخلاقی قانون (Moral laws) کی پیروی کرے اور اس کے سامنے اپنی جوابدہی کا خیال رکھ کر اس کی رضا کے لیے سعی کرے۔ یہ روش چونکہ فطرتِ کائنات اور فطرتِ انسانی کے مطابق ہے اس لیے اس کا آخری نتیجہ صلاح ہے، بننا اور ترقی کرنا ہے

(باقی ص۸۳ پر)

کا باعث بھی ہے۔ اور ہر وہ فعل جس کا رُخ تعمیر کی بجائے تخریب، قیامِ حیات کی بجائے فنا اور صلاح کی بجائے فساد کی طرف ہو جائے وہ بُرا ہے، بدی اور شر ہے اور وہی باعثِ غم بھی ہے[1]۔

انسان کے تجربات کی بہت لمبی فہرست اس زمین کے کونوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ قرآن کہتا ہے، کہ انسان اس لمبی زندگی میں ہر فعل کو آزما چکا ہے۔ ہر لغزش کی سزا اور ہر استواری کا انعام حاصل کر چکا ہے۔ پھر ان وارداتِ حیات کو آنکھ کھول کر دیکھو اور پھر انہی زلات کا ارتکاب نہ کرو۔ **قرآن کا عمرانی پیغام وسیع معنوں میں تاریخی استنباط کا پیغام ہے[2]۔**

انسان کی رہنمائی کا سارا بوجھ اس کی اپنی فطرت پر ہے۔ یہ تو ہوتا رہا کہ انسان نے ہر لغزش پر بہت بڑی انفرادی اور اجتماعی عقوبتیں برداشت کیں۔ مگر یہ کبھی نہ ہوا کہ نوعِ انسان کا پورا کاروانِ حیات کسی لغزش کی ایسی گھاٹی میں کھو جاتا کہ مٹ جاتا۔ اس کی زندگی راہ کے پیچ و خم کو طے کرتی ہوئی برابر بڑھتی آ رہی ہے اور ارتقائی منازل کا عزم کیے ہوئے ہے۔

وقت آ گیا ہے کہ تمہیں بتا دیں کہ خوشی کا مسکن کہاں ہے۔ تم اُسے ڈھونڈ رہے تھے۔ وہ اُن اعمال کا نتیجہ ہے جو موجبِ صلاح ہوں۔ اُن کو معلوم کر لو، اُسے پا لو گے۔ ان اعمال کو انسان کے خود اپنے تجربات کی تائید حاصل ہے۔ نیکی انسان کا داخلی اور موضوعی رجحان ہے، یہ کوئی معروضی حیثیت کی چیز نہیں کہ تمہیں اس کی تلاش کے لیے کہیں باہر سفر کرنا پڑے۔

قرآن انسان کی فطرت کو کامل اعتماد اور بھروسے کی نظر سے دیکھتا ہے:

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ؕ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ؕ لَا تَبْدِيْلَ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۷۲) فوز اور فلاح ہے۔ فَاَمَّا مَنْ طَغٰى وَاٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا فَاِنَّ الْجَحِيْمَ هِيَ الْمَاْوٰى ۝ وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى (ترجمان القرآن)

[1] ترجمان القرآن۔ یہ بات اصل حقیقت کے برعکس ہے۔ دراصل خیر وہ ہے جو انسان کے بنانے والے کے منشاء کے مطابق ہو اور اس کا نتیجہ صلاح ہے۔ اور شر وہ ہے جو اس کے منشاء کے خلاف ہو اور اس کا نتیجہ فساد ہے۔

[2] ترجمان القرآن۔ اس بیان میں بھی غلطی ہے اور اس کو ہم نے آگے ایک دوسرے حاشیہ میں واضح کر دیا ہے۔

لِخَلْقِ اللّٰهِ ۚ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (الروم-۳۰)

"پھر تو یکسو ہو کر اپنے آپ کو دین پر جما دے۔ اللہ کی فطرت (ساخت) پر قائم ہو جائے جس پر اُس نے انسانوں کو پیدا کیا ہے۔ اللہ کی بنائی ہوئی ساخت میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں۔ یہی سیدھی روش ہے۔ لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔"

دیگر مطالب سے کٹ کر صرف اِس مقام کو واضح کرنے کی ضرورت ہے۔ قرآنِ حکیم امورِ ذیل کی طرف انسان کو متوجہ کرتا ہے:

(۱) ایک مقرر دین (راہ) پر آجاؤ۔

(۲) وہی ایک راہ ہے جو انسان کی فطرت کی راہ ہے۔ انسان جا ہی اسی پر سکتا ہے۔ یہ اس لیے کہ دائیں بائیں متوجہ ہونا اس کے لیے باعثِ ہلاکت ثابت ہُوا، ہو رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔[1]

[1] ترجمان القرآن۔ فاضل مضمون نگار نے یہاں استدلال کا رُخ اُلٹا پھیر دیا ہے۔ ان کے بیان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فطرت کی راہ ایک ہی صحیح ممکن العمل راہ اس وجہ سے ہے کہ دائیں بائیں متوجہ ہونا تجربہ سے مہلک ثابت ہُوا، حالانکہ دراصل یہ اس راہ کے صحیح ہونے کی وجہ نہیں ہے بلکہ انسان کے ہلاکت میں مبتلا ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس راہ سے ہٹتا۔ فاضل موصوف کے طرزِ بیان سے آدمی کو یہ غلط فہمی لاحق ہو سکتی ہے کہ "قرآن نے اس راہ کو انسان کے تاریخی تجربات سے اخذ کیا ہے، یعنی ہزارہا برس کے تجربات سے معلوم ہُوا کہ انسان جب کبھی اس طرف یا اُس طرف ہٹا، ہلاک ہو گیا، لہٰذا اس علم کی روشنی میں اس نے دونوں طرفوں کے درمیان ایک بیچ کی راہ نکال لی جو سیدھی اور صحیح ہے اس لیے کہ تاریخ کا تجربہ اس کو ایسا ہی ثابت کرتا ہے۔" حالانکہ قرآن کا علم تجربات و مشاہدات سے اخذ کیا ہُوا علم نہیں ہے۔ علم کی یہ نوعیت انسان کے لیے خاص ہے۔ قرآن کے مصنف، خداوندِ برتر کے علم کی یہ نوعیت نہیں ہے۔ اس نے تو انسان کو خود بنایا ہے۔ وہ اپنی ساخت کو اور اس کے مزاج کو بذاتِ خود جانتا ہے۔ اسی ذاتی علم کی بنا پر وہ صانع کے سے تحکم کے ساتھ کہتا ہے کہ تو اس فطرت پر بنایا گیا ہے اور تیرے لیے یہ راہ صحیح ہے۔ رہے وہ شواہد جو قرآن میں انسانی تاریخ سے پیش کیے گئے ہیں تو وہ اس حیثیت سے نہیں ہیں کہ یہ وہ مواد ہے جس سے دینِ قیم کا استنباط کیا گیا ہے۔ بلکہ ان کے پیش کرنے کا مدعا انسان کو یہ بتانا ہے کہ تو خود اپنے تجربات کی کسوٹی پر

(باقی صفحہ ۷۵ پر)

(۳) اسی پر انسان کی فطرت کو تعمیر کیا۔ یہ سیدھی راہ ہے۔ اُس کی ساخت کو ادھورا نہیں چھوڑا کہ وہ کسی معروضی یا باہر کی ہدایت کا امیدوار رہے[1]۔ اسی پر چلتے جانا بھلائی ہے۔

(۴) یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے تم میں سے اکثر واقف نہیں۔

اسی کو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے "الفطرۃ" کہا:۔

ما من مولود الا یولد علی الفطرۃ فابواہ یھودانہ او ینصرانہ

"ہر پیدا ہونے والا اسی ایک فطرۃ پر پیدا کیا جاتا ہے۔ جس پر اس کی ہدایت کا پورا بوجھ رکھا جاتا ہے۔ پھر تم ہو کہ اُسے مختلف نام دے دیتے ہو[2]"

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۷۴) اس راہ کو پرکھ کر دیکھ لے، جب تو اس پر چلا تیری زندگی کی کل سیدھی چلی اور جب کبھی تو اُس سے ہٹا وہ بگڑ گئی۔ آگے چل کر متعدد مقامات پر اس مضمون میں ایسے فقرے ملتے ہیں جن سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ قرآن اور نبی صرف تجربات سے حاصل شدہ علم کو پیش کرتے ہیں۔ ان تمام مقامات کی تصحیح کے لیے یہ تنبیہہ کافی ہے۔

[1] ترجمان القرآن۔ یہ الفاظ پھر غلط فہمی پیدا کرنے والے ہیں۔ انسان کی فطرت میں اس کے خالق نے فجور اور تقویٰ کا وجدانی علم ضرور رکھ دیا ہے، دونوں راہوں کو دیکھنے، سمجھنے اور پرکھنے کی استعداد ضرور ودیعت کی ہے، مگر حتمی و قطعی طور پر یہ جاننا کہ یہی تقویٰ کی راہ ہے، یہی مقتضائے فطرت ہے، اور اسی میں خیر و صلاح ہے، تنہا انسانی فطرت کے بس کی بات نہیں ہے۔ انسان یہاں اپنے صانع کی طرف سے رہنمائی کا محتاج ہے۔ اس کی طرف سے جلی اور روشن رہنمائی کے بغیر وہ محض اپنی فطرت کی رہبری میں اس راہ کا خود اکتشاف نہیں کر سکتا۔ البتہ جب وہ راہ پیش کر دی جائے تو فجور و تقویٰ کا وہ وجدانی علم جو اس کی فطرت میں موجود ہے، اُس راہ کو (خود اپنی گم شدہ چیز کو) پہچاننے میں مدد ضرور دے سکتا ہے، بشرطیکہ اکتسابی علوم کی کج رفتاری اور تعصبات و رجحاناتِ نفس کی غلط افتاد نے اس وجدان کو مسخ نہ کر دیا ہو۔

[2] ترجمان القرآن۔ پہلا فقرہ ارشادِ نبوی کے مطابق ہے، مگر بعد کے دونوں فقرے خود قائل (صلعم) کے مدعا سے بہت دُور ہٹ گئے ہیں۔ حضورؐ نے نہ اس حدیث میں یہ فرمایا ہے اور نہ کبھی کسی موقع پر آپ نے ایسا کہا کہ ہر انسان کی اپنی فطرت ہی پر اس کی ہدایت کا پورا بوجھ رکھ دیا گیا ہے۔ اگر بات یہی ہوتی تو خدا کی طرف سے (باقی صفحہ ۷۶ پر)

(۵) یہی فطرت جس کے سہارے انسان زندگی کے لمبے سفر کو طے کرنے نکلا ہے یہ الدین القیم ہے۔ ایسی راہ ہے جو تمہیں قائم رکھتی ہے مٹنے سے بچاتی ہے۔ ہلاکت سے بچاتی ہے اور قیام کی ضامن ہے۔ انسان کس کے سہارے چلتا ہے؟ فطرت کے۔ فطرت کا طریق کار یا مذہب عمل کیا ہے؟ اصلاح و تعمیر۔ وہ الدین القیم ہے۔ تمہاری زندگی کو قائم رکھنے والی راہ۔

قرآن ہمیں اپنے عمرانی پیغام کی صحیح معرفت عطا کرنے کے لیے ہماری حیات کے ارضی تجربات کو ہمارے سامنے پھیلاتا ہے۔ اور صرف ان اعمال کو جنہیں ہم نے خود دیکھا کہ وہ ہمیں گھاٹے میں رکھتے چلے آئے ہیں وہ بدی کہتا ہے۔ ان کے برعکس وہ اعمال جو ہماری آنکھوں نے خود دیکھے کہ وہ آج تک اصلاح کا باعث بنتے چلے آئے ہیں، انہیں وہ نیکی یا بھلائی کہتا ہے۔ ہماری حیاتِ ارضی کے لیے انہیں بہتر بتاتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ تم روزمرہ کے معاملات میں (۱) سچائی (۲) فیصلہ کی پختگی (۳) اطاعت رسول اور اطاعتِ الٰہی کو اختیار کرو۔

(بقیہ حاشیہ ص۷۵) الگ مستقل ہادی آنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ رہا تیسرا فقرہ تو وہ بھی حدیث کے مفہوم سے پوری طرح مطابق نہیں ہے۔ حضورؐ کا مدعا دراصل یہ تھا کہ ہر بچہ اس صحیح فطرت پر پیدا ہوتا ہے جس پر اللہ نے انسان کو بنایا ہے لیکن جس سوسائٹی میں وہ آنکھیں کھولتا ہے وہ اگر فطرت کی راہ سے ہٹی ہوئی ہو تو وہ اس بچے کو بھی اپنی غلط راہ پر لگا لیتی ہے۔

لہ ترجمان القرآن۔ عربی زبان میں قیام کا اصل مفہوم راستی (کجی کی ضد) ہے۔ دینِ قیم وہ راہ ہے جو خود سیدھی اور مستقیم ہے، اور جو اپنے راہرو کی زندگی کو راستی پر قائم رکھنے والی اور کجی سے بچانے والی ہے۔ مٹنے اور ہلاک ہونے سے بچنا اس راستی و راست روی کا نتیجہ ضرور ہے اگر فی نفسہٖ مقصود نہیں ہے۔ عموماً مغربی نظریات کے اثر سے بقاء (Survival) اور تسلسلِ حیات (Continued existence) کی اہمیت لوگوں کی نگاہوں میں زیادہ ہو گئی ہے، اس لیے وہ "دینِ قیم" کے لفظ میں جب قیام کا مادہ دیکھتے ہیں تو خواہ مخواہ ان کا ذہن بقاء اور تسلسلِ حیات ہی کے مفہوم کی طرف چلا جاتا ہے۔

کیوں؟ اس لیے کہ صرف یہی اعمال (۱) تمہارے روزمرہ کے معاملات میں اصلاح اور بناؤ پیدا کر سکتے ہیں (۲) تم سے تمہاری بدیوں کو کاٹ کر الگ کر سکتے ہیں (۳) تمہیں کامیاب زندگی عطا کریں گے۔

اب ان مقامات کو سامنے رکھ کر سورۂ احزاب پڑھو:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا ۝ يُصْلِحْ لَكُمْ أَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ ۗ وَمَنْ يُطِعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيمًا ۝ (احزاب - ۷۰، ۷۱)

حق شناس آنکھیں رکھتے ہو تو دیکھو اطاعتِ خدا اور رسول کو بھی کسی معروضی حُسن (Objectivity) کے لیے قبول کر لینے کو نہیں کہا۔ بلکہ کہا تو یہ کہا کہ تم دیکھ چکے ہو کہ یہ تمہاری اصلاح کا باعث ہے[1]۔

قرآن کہتا ہے:۔

آپس میں نہ جھگڑو۔ اس لیے نہیں کہ اس میں کوئی معروضی بدی ہے۔ بلکہ اس لیے کہ ایسا کرنے سے انسان کی زندگی قائم نہیں رہ سکتی۔ اس میں فساد اور ہلاکت آجاتی ہے۔ مٹنے والوں کے آثارِ باقیات سے پوچھ لو کہ ایسا کرنے سے تمہاری طاقت سُست پڑ جائے گی اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔

اس کے بجائے تم یہ کرو کہ

(۱) اللہ اور اس کے رسول کے اطاعت گزار بن جاؤ۔

(۲) صبر کرو یعنی مصائب کے مقابلہ میں عزم کے ساتھ کھڑے رہو اس لیے کہ بالآخر جیت اُسی کی ہوگی جو زیادہ مشکلات جھیلنے والا ہوگا۔

اور یہ چیزیں کوئی نئی نہیں۔ انسان نے ان کو خود عملاً دریافت کیا ہے۔ یہ اُس کے اپنے دل کی آوازیں ہیں۔

وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ ۖ وَاصْبِرُوا ۚ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ ۝ (الانفال - ۴۵)

---

[1] ترجمان القرآن۔ اس آیت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اطاعتِ خدا اور رسول اس لیے کرو کہ تجربہ سے اس کا موجب صلاح ہونا ثابت ہوا ہے۔ بلکہ اس کا واضح مفہوم یہ ہے کہ ایسا کرو گے تو اللہ تمہارے اعمال کو درست کر دیگا اور تمہیں کامیابی عطا کریگا۔

(۱) جو لوگ اللہ کے سامنے اس طرح کھڑے ہوتے ہیں جیسے وہ ایک باجلال بادشاہ کے حضور ہوں۔

(۲) جو لوگ ہر لغو بات سے بچتے ہیں،

(۳) اپنی کمائی سے محتاجوں کو دیتے ہیں،

(۴) زنا سے الگ ہوتے ہیں،

(۵) امانتوں کی حفاظت کرتے ہیں،

(۶) وعدہ کے پکے ہوتے ہیں،

اُن کے کاموں میں بگاڑ یا فساد رہ نہیں پاتے۔ انسان کی ہر بستی کی یہ ایک آزمائی ہوئی حقیقت ہے۔ ایسے لوگ آج تک فلاح پا چکے ہیں اور آیندہ پاتے رہیں گے۔

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰۤى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝ (المومنون - ۱ تا ۶)

قَدْ اَفْلَحَ، ماضی کا صیغہ یہاں خاص لطف دے رہا ہے۔

قرآن انسان کو اس کی لمبی سرگزشت کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ وہ تم سے پوچھتا ہے کہ کیا تم زمین کے احوال کو گھوم کر مشاہدہ نہیں کرتے؟ اپنے پچھلوں کے باقیات کو آنکھیں کھول کر نہیں دیکھتے؟ مٹنے والوں کے کھنڈروں سے جو صدائیں بلند ہو رہی ہیں کیا وہ تمہارے کانوں تک نہیں پہنچتیں؟ تمہارے سینوں کے اندر دل تو صرف اس لیے دیئے گئے تھے کہ تم اُن سے درس و عبرت کے خزانے جمع کر لیتے۔ اُن کے تجربات سے فائدہ اُٹھاتے۔ جس نوع کے اعمال اُن کے لیے اصلاح کا باعث ہوئے، انہیں اختیار کر لیتے۔ جو انہیں ہلاکت کی طرف لے گئے اُن سے بچ جاتے۔ وہ اگر اپنی کوتاہیوں کی نذر ہو گئے تو تم اُن سے عبرت حاصل کرتے۔ دیکھو تم بھی اُن کی طرح خرابی کی آزمائی ہوئی راہ پر ہوں کو نہ آزماؤ۔ تمہارے آباء کی داستانِ حیات صدیوں پر پھیلی ہوئی ہے۔ پھر کیا تمہارے دل و دماغ نہیں کہ تم پھر اُنہی ہلاکتوں کو آزمانے جا رہے ہو۔ بس سمجھ جاؤ اور اُن شاہراہوں کی طرف بڑھو جو تمہارے لیے بہتر

اور نفع رساں ہیں۔

یاد رکھو! یہ وہ نتائج ہیں جنہیں تمہارے اجداد نے کئی ہزار برس میں مرتب کیا۔ وہ بھی کوئی تھوڑے دنوں کی فرصت میں ان نتائج پر نہیں پہنچے تھے۔ تمہاری گنتی کے ایک ہزار سال انسان کی مجموعی زندگی کے ارتقاء میں ایک دن کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پھر جو مجموعی نتائج انسان نے اس کاوش سے مرتب کیے ہیں تم اُن سے فائدہ کیوں نہیں اٹھاتے۔

یہ نہ سمجھو کہ آج سے ایک ہزار سال پہلے کے انسان سے تمہارا کوئی رابطہ نہیں۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ جہاں تک انسانی حیات کی تعمیر اور انسانی فطرت کی رفتار کا تعلق ہے وہ ایک ہزار سال تو ایک دن کے مانند ہیں۔ یعنی اس کے ڈانڈے تمہاری زندگی سے اور تمہاری زندگی سے ایک ہزار سال قبل و بعد کے انسان کی زندگی سے اس طرح ملے ہوئے ہیں جیسے آج کا دن آنے والے اور گزرے ہوئے کل سے ملا ہوا ہے۔ پھر جیسے پیر کے نتائج سے منگل اور منگل کے نتائج سے جمعرات الگ نہیں اسی طرح تم انسانیت کے ماضی اور مستقبل کے درمیان کی ایک کڑی ہو۔ پھر کیا تمہارے پہلو میں دل نہیں کہ تم عبرت کے ذخائر جمع نہیں کر لیتے؟

شاید تمہارے کان نہیں کہ تم نہیں سنتے۔ تمہارے پاؤں نہیں کہ تم زمین کے گوشوں میں سفر کو نکلتے اور اپنے لیے ان اعمال کی جو آغازِ آفرینش سے حیاتِ انسانیہ کی اصلاح کرتے چلے آئے ہیں، اور اُن کی جو روزِ اوّل سے حیاتِ ارضی میں فساد پیدا کرتے چلے آئے ہیں، اپنی رہنمائی کے لیے ایک فہرست بنا لیتے۔

اَفَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَتَکُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ یَّعْقِلُوْنَ بِهَآ اَوْ اٰذَانٌ یَّسْمَعُوْنَ بِهَا ج فَاِنَّهَا لَا تَعْمَی الْاَبْصَارُ وَلٰکِنْ تَعْمَی الْقُلُوْبُ الَّتِیْ فِی الصُّدُوْرِ ۝ وَیَسْتَعْجِلُوْنَکَ بِالْعَذَابِ وَلَنْ یُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ ط وَاِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّکَ کَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ۝ (الحج - ۴۵، ۴۶)

کیا یہ لوگ ملکوں میں چلے پھرے نہیں کہ ان کے دل اس قابل ہو جاتے کہ سمجھیں بوجھیں۔

یا کان ہی کھل جاتے کہ حقیقت کی ترجمانی کرنے والے کی بات سنیں۔ دراصل آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ وہ دل اندھے ہو جایا کرتے ہیں جو سینوں کے اندر پوشیدہ ہیں یہ لوگ تم سے عذاب کے مطالبے میں جلدی مچا رہے ہیں۔ اللہ ہرگز اپنے وعدہ کے خلاف نہ کرے گا مگر تیرے پروردگار کے ہاں ایک دن کی مقدار ایسی ہے جیسے تم لوگوں کی گنتی میں ایک ہزار برس"

اگر تم یہ عبرت اندوزی کی خواہش لے کر اپنے ماضی کے پاس جاؤ تو دیکھو گے کہ قبل انسانی کو نبیوں کی دعوت سے ہمیشہ فائدہ ہی پہنچا۔ انہوں نے ہمیشہ تمہاری مردہ روحوں کو زندہ کیا۔ پھر تم بھی ان کی دعوت سے زندگی حاصل کرو۔

"یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِیْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا یُحْیِیْكُمْ ۚ (الانفال-۲۴)

"اے ایمان لانے والو! اللہ اور اس کے رسول کی پکار پر لبیک کہو جبکہ وہ تمہیں ایسی چیز کی طرف بلائے جو تم کو زندگی بخشنے والی ہے"

جھٹلانے والے انہیں ہر عہد میں جھٹلاتے رہے۔ مگر اُن کا انجام کیا ہوا؟ ہولناک نتائج نے انہیں آلیا اور وہ تمہارے لیے دردناک داستانیں چھوڑ گئے تم ان کی ٹوہ میں نکلو۔ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِیْنَ ۝ (آل عمران-۱۳۶)

ایمان و تقویٰ (الانفال-۲۸) فی سبیل اللہ خرچ کرنا (الانفال-۶۰) عہد و پیمان کی پختگی (الانفال کی آخری آیات) ہدایتِ الٰہی کی پیروی (طٰہٰ-۲۰) ان افعال کو تمہارے پچھلوں نے اپنی زندگی کے سفر میں آزما دیکھا ہے کہ یہ باعثِ اصلاح ثابت ہوتے رہے۔ ان کے برعکس جو اعمال کسی زمانے میں بھی تمہاری اصلاح نہ کر سکے بلکہ فساد کا موجب بنے وہ یہ ہیں:-

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِیْنَ اَعْمَالًا ۝ اَلَّذِیْنَ ضَلَّ سَعْیُهُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَهُمْ یَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ یُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ وَلِقَآئِهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِیْمُ لَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَزْنًا ۝ (الکہف ۱۰۳ تا ۱۰۵)

"ان سے کہو ہم تمہیں بتائیں کون لوگ اپنے کاموں میں سب سے زیادہ نامراد ہیں؟ وہ جن کی

ساری کوششیں دنیا کی زندگی میں کھو گئیں اور وہ اس دھوکے میں پڑے ہیں کہ بڑا اچھا کام بنا رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے پروردگار کے احکام و ہدایات کو نہ مانا اور اس سے انکار کیا کہ انہیں ایک روز اس کے حضور میں پیش ہونا ہے۔ اس لیے ان کے سارے کام اکارت گئے۔ اور اس لیے قیامت کے دن ہم ان کے اعمال کو کوئی وزن نہ دیں گے۔"

رسول کی ہستی اس سے زیادہ نہیں کہ وہ تمہیں زندگی کی ان آزمائی ہوئی راہوں سے آگاہ کرنے والا ایک انسان ہوتا ہے[1]۔ تم پر داروغہ نہیں ہوتا۔ تمہیں جبراً کسی راہ پر لانے کا ذمہ دار نہیں ہوتا۔ وہ اچنبھے اور عجائب کاریاں لے کر تمہارے پاس نہیں آتا۔ وہ تمہاری طرح بازاروں میں لین دین کرتا ہے۔ وہ تمہارا کفارہ ہو کر نہیں آتا۔ تم اُس کی باتوں کو ہنسی میں اُڑا دو، تم اُس کی ہدایت کو قبول نہ کرو۔ وہ تمہارے قلوب، آنکھوں اور کانوں پر کوئی قبضہ نہیں رکھتا کہ بہروں کو سنا دے اور اندھوں کو دکھا دے۔ یہ اُس کے بس کی باتیں نہیں نہ یہ کام اس کے سپرد کیا گیا ہے۔ تمہاری طرح وہ بھی صرف اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے۔

وَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ لِّيْ عَمَلِيْ وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ ۚ اَنْتُمْ بَرِيْٓـُٔوْنَ مِمَّآ اَعْمَلُ وَاَنَا بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ ۭ اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَلَوْ كَانُوْا لَا يَعْقِلُوْنَ ۝ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْظُرُ اِلَيْكَ ۭ اَفَاَنْتَ تَهْدِي الْعُمْيَ وَلَوْ كَانُوْا لَا يُبْصِرُوْنَ ۝ (یونس - ۴۰ تا ۴۳)

ان تجربات کو قرآن "نور" بھی کہتا ہے۔ دیکھو گے تو ان کی روشنی میں تمہاری زندگی کا ہر پہلو واضح

[1] ترجمان القرآن۔ رسول کے منصب کی یہ تعبیر صحیح نہیں۔ وہ مؤرخ یا محقق انسانیات (Anthropologist) نہیں ہوتا جس کا کام انسان پر گزری ہوئی کیفیات کا جائزہ لینا اور لوگوں کو پچھلی نسلوں کی آزمائی ہوئی راہوں سے آگاہ کر دینا ہو۔ اس کا علم تجربات و مشاہدات سے اخذ کیا ہوا علم نہیں ہوتا بلکہ حقیقت کا علم ذاتی جو خالقِ کائنات کے پاس ہے وہ وحی کے ذریعہ سے براہِ راست اُس کے پاس آتا ہے۔ اور چونکہ وہ حقیقتِ واقعہ کا علم ہوتا ہے اس لیے انسانی تجربات کی شہادت اس کی تائید کرتی ہے۔

ہو جائے گا۔ انسان جو جہل و جذبات کے حائلات سے ٹکراتا آگے بڑھ رہا ہے اور یہ اُس کے اپنے مرتب کردہ اصلاح کے اصول ہیں[1]۔ وہ کہتا ہے کہ اس زمین کی وراثت ان مصلحین کے لیے وقف ہے جو ان اصول کو پیشِ نظر رکھ کر زندگی کے سفر کو نکلیں اور یہ حقیقت صرف تمہارے لیے نہیں بلکہ زبور میں بھی ہم نے یہی کہا تھا یعنی یہ بہت پرانی حقیقت ہے۔ (الانبیاء - ۱۰۴)

قرآن جب کسی برباد ہونے والی بستی یا قوم کا ذکر کرتا ہے تو ہر موقع پر یہ حقیقت دُہرا دیتا ہے کہ ہم کسی پر ظلم نہیں کرتے یعنی یہ جو اس بستی کو سزا دی گئی یہ کوئی معروضی واقعہ نہ تھا بلکہ انہوں نے خود ظلم کیا (سورۂ توبہ - ۶۹)۔ یہ اُن کے اندر کے اعمال تھے۔ یہ ایک موضوعی واقعہ تھا۔

اپیکیورس نے خوشی کو ڈھونڈا۔ بینتھم نے خوشی کی بہتات (Quantity) کی آرزو کی۔ جان اسٹوارٹ مل نے بہتر خوشی (Quality) پر زور دیا۔ مگر کوئی بھی اس طرف نہ گیا کہ ان افعال کو تلاش کیا جائے جو خوشی پیدا کرتے ہیں۔ اگر یہ ہو سکتا کہ درخت کا تنا تو نہ ہو مگر اُس کے ہرے بھرے پتے پھوٹ رہے ہوں تو مجرد خوشی کو تلاش کرنے والے ناکام نہ رہتے۔ غم اور خوشی تو تاثرات ہیں جو مختلف افعال کے نتائج ہوا کرتے ہیں۔

ایک کو یونیورسٹی کے اعلیٰ امتحانات میں کامیاب ہو کر خوشی ملتی ہے۔ ایک کو شراب کے جرعات میں۔ دونوں خوش ہیں۔ اب ایک تیسرا شخص جو ان کو دیکھ رہا ہے چاہتا ہے کہ اُسے بھی خوشی حاصل ہو مگر وہ نہ تو امتحانات میں بیٹھنا چاہتا ہے اور نہ شراب کو خریدنے کے لیے دام رکھتا ہے۔ تو بتاؤ کیا خوشی کا حصول اس کے لیے ممکن ہے؟ خوشی تو محض ایک نتیجہ تھی۔ پس تم کہو گے کہ وہ صحیح سوچ نہ سکا۔ خوشی کے متلاشیوں کے لیے صحیح طریقہ تو یہ تھا کہ وہ ایسے درخت کی جستجو کرتے جس کی ٹہنیوں میں

---

[1] ترجمان القرآن۔ قرآن ان تجربات کو نور نہیں کہتا بلکہ خدا کی طرف سے آئی ہوئی دانش و ہدایت کو نور کہتا ہے۔ اسی طرح یہ بھی صحیح نہیں کہ اصلاح کے جو اصول قرآن پیش کر رہا ہے وہ انسان کے اپنے مرتب کردہ ہیں۔ تاریخ اور انسانیات کے مطالعہ و تحقیق سے معلومات کا جتنا ذخیرہ آج تک فراہم ہوا ہے وہ سب کا سب سامنے رکھ کر بھی انسان اپنی فلاح و سعادت کے صحیح اصول خود مرتب نہ کر سکا۔

خوشی کے پھول آتے ہوں۔ مگر وہ اُلجھے رہے اور اس حقیقت کو نہ پا سکے۔

اب تم دیکھ چکے ہو کہ خوشی صرف اُن افعال سے پیدا ہوتی ہے جو حیاتِ انسانیہ کے لیے آج تک بناؤ سنگھار کا ذریعہ ثابت ہوتے رہے ہیں۔ باعثِ صلاح رہے ہیں، جن میں تباہی اور فساد کا اصلاً کوئی امکان نہیں، چنانچہ

۱۔ قرآن ماضی کو سامنے رکھتا ہے۔

۲۔ تمہارے لیے ماضی نے جن امور کو باعثِ صلاح پایا انہیں شمار کرتا ہے.. اور تمہیں، اگر تم انہیں اختیار کرلو تو ایک دائمی کامرانی کی بشارت دیتا ہے۔ زمین کو تمہاری وراثت بتاتا ہے۔ نبی کو وہ اسی لیے بشیر کہتا ہے اس لیے کہ وہ بشارت دیتا ہے۔ ان الارض یرثھا عبادی الصالحون (الانبیاء ۔ ۱۰۴)

۳۔ اور وہ افعال جنہیں تم دیکھ چکے ہو کہ وہ مفاسد ہیں ان سے تمہیں خبردار رہنے کے لیے کہتا ہے۔ تمہیں ان کے سوپار آزملائے ہوئے انجاموں سے ڈراتا ہے۔ نبی کو وہ اسی لیے نذیر کہتا ہے اس لیے کہ وہ ڈراتا ہے۔

۴۔ مقصود یہ کہ قرآن خود انسان کی فطرت کو اس کا رہنما بتاتا ہے۔ وہ اپنی اندرونی ہدایت سے زندگی کے سفر کو نکلا ہے۔

۵۔ تاریخ کی شہادت یہ ہے کہ انسان خوشی کی تلاش نہیں کرتا بلکہ اپنے قیام و صلاح کا طلبگار ہے۔ خوشی اگر فساد و ہلاکت کا باعث ہو تو وہ اسے اختیار نہیں کرتا۔

کانٹ اس طائفہ (Epicureanism) کے مرض کے صحیح مقام پر انگلی نہ رکھ سکا۔ وہ یہ نہ سمجھا کہ اس پر پھاہا کہاں رکھا جا سکتا ہے، فکر کی غلطی کیا ہے اور اس کی صحت کیسے کی جا سکتی ہے، لہٰذا وہ ایک دوسرے گوشے میں نکل گیا، وہ انسان کی فطرت کو مایوسی سے دیکھتا ہے۔ اس نے انسان سے الگ نیکی کا ایک نظام نامہ مرتب کیا اور انسان کو کہا کہ وہ اُسے قبول کرے۔ اس نیکی کے معروضی نظریہ کی صحیح معرفت کے لیے تم ایک اندھے کو تصور کرو جو اپنی آنکھوں پر اعتبار نہیں کر سکتا اور ایک بچے کی انگلی پکڑے بازار کی بھیڑ سے گزر رہا ہے۔ اسی طرح یہ معروضی محصلین انسانی فطرت پر اعتماد

نہیں رکھتے۔ وہ انسان کے اندھے ہاتھوں میں اپنا نظام نامہ دے کر اُسے زندگی کی تاریکیوں سے گزارنا چاہتے ہیں۔

غور کرو جب انسان فطرتاً اندھا ہے تو اس کی رہنمائی کیسی؟ تم نے کسی اندھے کو نہیں دیکھا کہ وہ بچہ جو لاٹھی تھامے اس کے ساتھ جاتا تھا وہ دن کے چوبیس گھنٹے اور گھنٹے کے ساٹھ منٹ اور منٹ کے ساٹھ سیکنڈ اس کے ساتھ رہ سکتا ہو۔ پھر اور دیکھو آگ فطرتاً جلاتی ہے۔ تم اُسے جلانے سے روک نہیں سکتے۔ انسان اگر فطرتاً اندھا ہے تو تم کون ہو کہ اسے نظام نامہ کی لاٹھی دے کر اس کی فطری کوری کو دُور کر سکو۔

نیکی کا یہ معروضی یا خارجی تخیل تھا۔ ظاہر ہے یہ استدلال کے مطالبات کا ساتھ نہیں دیتا۔